بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

مرض خواہ بظاہر کتنا ہی معمولی ہو مگر نتائج کے اعتبار سے اس وقت انتہائی پریشان کن صورت اختیار کر لیتا ہے جب مریض کے اندر اپنی علالت کا احساس ختم ہو جائے اور وہ مرض کو صحت کو سمجھتے ہوئے اس پر ذہنی اعتبار سے اطمینان کا اظہار کرنے لگے۔ یہ بات جس قدر جسمانی امراض کے بارے میں صحیح ہے اسی قدر افراد اور قوموں کے روحانی اور اخلاقی عوارض کے بارے میں بھی درست ہے۔ کسی اخلاقی انحطاط کے شکار فرد اور روبہ زوال قوم کی زندگی اس وقت تشویشناک مرحلے میں داخل ہوتی ہے جب فرد اور قوم کے دل میں احساسِ زیاں کی چنگاری بجھ جاتے اور انحطاط اور زوال پر کرب و اضطراب کی ٹیس محسوس کرنے کے بجائے قلب و دماغ آسودگی تلاش کرنے لگیں۔ یہ کیفیت اس امر کی واضح شہادت فراہم کرتی ہے کہ اس فرد اور قوم میں اصلاحِ حال کی کوئی اُمنگ اور ولولہ باقی نہیں رہا اور وہ اپنی بربادی کو اپنا مقدر سمجھ کر اُس کے ساتھ ذہنی مناسبت پیدا کرنے کے لیے تیار ہے۔

یہ بات اگرچہ بڑی تکلیف دہ ہے مگر ہے بالکل صحیح کہ ہم اہلِ پاکستان بحیثیتِ قوم مرض کے اسی تشویشناک مرحلے میں سے گذر رہے ہیں جس میں ہم انحطاط اور بربادی کے ساتھ ذہنی مناسبت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے مختلف حیلے بہانے تراشتے رہتے ہیں۔ ہماری اس المناک اخلاقی حالت کی یُوں تو متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں مگر ہم یہاں صرف چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

جن لوگوں نے اُس تحریک کا مطالعہ کیا ہے جس کے نتیجے میں پاکستان معرضِ وجود میں آیا وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلامی نظام کے اِحیاء کے نعرے نے اس تحریک کو قوت و توانائی بخشی اور اس نیم برّاعظم کے مسلمان خواہ اُن کا تعلق ہندو اکثریت کے علاقوں سے تھا یا مسلم اکثریت کے

علاقوں سے دیوانہ وار اس کی طرف بڑھے اور جان و مال کی بے مثال قربانیاں دے کر پاکستان کی شکل میں ایک خطۂ ارض اس توقع پر حاصل کیا کہ یہ اسلام کا گہوارا ہوگا۔ احیائے اسلام کے مقدس جذبے کو سینے میں لیے ہوئے عوام نے جس نہج پر جدوجہد کی اُس سے انہوں نے ایک سبق یہ بھی سیکھا کہ دورِ حاضر میں مسلمانوں کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے آمرانہ ہتھکنڈے استعمال کرنے سے پوری طرح اجتناب کرنا چاہیے اور جمہوری ذرائع سے اسلامی نظام کے قیام کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غیر جمہوری راستوں سے بعض اوقات برسوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے اور آناً فاناً حالات کا رُخ بدلنے کی کئی ایک صورتیں نکل آتی ہیں مگر پوری انسانی تاریخ میں اسی نوعیت کے جو لاتعداد تجربات کیے گئے ہیں وہ اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ ان راستوں سے جو انقلابات بھی آئے ہیں ان میں سے بہت کم نتائج کے اعتبار سے انسانیت کے لیے کسی دیرپا خیر اور بھلائی کے ضامن بنے ہیں جو انقلابات سازشوں کے ذریعہ آتے ہیں وہ سازشوں اور زیر زمین سرگرمیوں کو اپنی آغوش میں پالتے ہیں اور اس طرح معاشرے کو آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر ڈال دیتے ہیں جہاں انسانوں کی اجتماعی زندگی ہر وقت زیر و زبر ہوتی رہتی ہے یا اُسے زیر و زبر ہونے کا برابر کھٹکا لگا رہتا ہے۔ جمہوریت کا راستہ اگرچہ لمبا راستہ ہوتا ہے اور اس پر گامزن ہو کر کوئی انقلاب برپا کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ لیکن اس راستے سے جو انقلاب آتا ہے وہ نتائج کے اعتبار سے نہ صرف مفید بلکہ دیرپا بھی ہوتا ہے۔ اس میں سازشوں کو پرورش پانے کے بہت کم مواقع میسر آتے ہیں اور اگر بگاڑ پیدا بھی ہو تو اُس کا بروقت مؤثر تدارک کیا جا سکتا ہے۔

احیائے اسلام کا ارفع و اعلیٰ نصب العین اور جمہوریت کا محفوظ و مامون راستہ ان دو چیزوں کو قلب و دماغ میں رکھ کر تحریک پاکستان نے اپنے سفر کا آغاز کیا مگر اس ملک کے معرض وجود میں آنے کے ساتھ ہی ان دونوں کے خلاف خوفناک سازشوں کا سلسلہ شروع کیا گیا تاکہ اہلِ پاکستان اپنی صلاحیتوں کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگا کر گوہرِ مقصود پانے کے بجائے تخریب و بربادی کا شکار ہوں۔ اسلام کے بارے میں لوگوں کے اندر فکر و نظر اور جذبہ و احساس کی جو ہم آہنگی موجود تھی اُسے ختم کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا جانے لگا اور اس کام میں جن لوگوں نے بھی کوئی خدمت سرانجام

دینے کی پیش کش کی اُن کی حکومت کی طرف سے پوری طرح حوصلہ افزائی کی گئی۔ خلافِ اسلام تحریکات اور نظریات کی باقاعدہ سرپرستی کی گئی اور ابلاغِ عامہ کے جس قدر ذرائع ملک میں موجود تھے فکری انتشار پھیلانے والوں کو ان سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے مواقع فراہم کیے گئے۔ ملک میں نظامِ تعلیم وہ رائج کیا گیا جو نوخیز نسلوں کو خدا کا مطیع و فرمانبردار بنانے کے بجائے اول تو اس کا باغی بنائے لیکن اگر یہ "مطلوبہ معیار" حاصل نہ ہو سکے تو کم از کم اُن کے ذہنوں کو تشکک کی آماجگاہ بنا کر انہیں عملاً ماؤف کر دے تاکہ وہ اسلام کے لیے بالکل بیکار ہو کر رہ جائیں۔ اسلام کے خلاف ان سب تخریبی کارروائیوں کے نتائج سامنے ہیں۔ اتحاد کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہیں اور انتشار کے تاریک سائے زندگی کے ہر شعبے میں بڑی سرعت کے ساتھ پھیلتے جا رہے ہیں۔ اسلامی اخوت کا جذبہ تیزی کے ساتھ ٹوٹتا جا رہا ہے اور اس کی جگہ چھوٹی چھوٹی قومیتیں ایک دوسرے کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات لیے ہوئے معرضِ وجود میں آ رہی ہیں۔ ایک خدا اور ایک رسول کو ماننے والی وہ قوم جو آج سے ۲۵ برس پیشتر یہ دعویٰ لے کر اٹھی تھی کہ اس کی قومیت کی اساس رنگ، نسل، زبان کسی بھی مادی چیز پر نہیں بلکہ محض ایک عقیدے پر ہے، اُس کے افراد آج رنگ، نسل اور زبان کے جھگڑوں میں اُلجھ کر ایک دوسرے کو تباہ و برباد کرنے کے درپے ہیں۔

یہ سب کچھ یونہی محض اتفاقی طور پر تو نہیں ہو رہا بلکہ اس کے پیچھے کفر کی ایک منظم سازش موجود ہے جو اس ملک کو قوت و طاقت کے سب سے بڑے سرمدی سرچشمے سے محروم کرنا چاہتی ہے تاکہ اس کا وجود باقی نہ رہے۔

اِس خطۂ پاک میں اسلام کا جو حشر ہوا ہے وہ اب کوئی ڈھکی چھپی داستان نہیں رہی۔ اس کے اثرات اتنے نمایاں ہو چکے ہیں کہ کوئی ان سے آنکھیں بند بھی کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ اسلام کے ساتھ ساتھ یہاں جمہوریت کی بھی جس طرح مٹی پلید ہوئی ہے یہ سانحہ بھی کسی اعتبار سے کم المناک نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ پاکستان نے احیاءِ اسلام کے لیے جمہوری راستہ اختیار کرنے میں جس تدبّر کا ثبوت دیا تھا اور جس سے یہ اُمید کی جا سکتی تھی کہ دوسرے مسلمان ممالک جن سازشوں کا شکار ہو کر برباد ہو رہے ہیں اُس بربادی سے پاکستان بچ جائے گا، وہ طاغوتی طاقتوں کے لیے

خطرے کا بہت بڑا الارم تھا۔ اس لیے وہ اسلام کی بیخ کنی کرنے کے ساتھ ساتھ اول روز سے اس بات کے لیے بھی برابر کوشاں رہیں کہ اس ملک کو جمہوریت کے راستے سے ہٹا کر آمریت کی راہ پر ڈالنے کا اہتمام کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے باقاعدہ سازشیں تیار کی گئیں اور ان سرکاری ملازموں کی پشت پناہی کی گئی جن کی وساطت سے اس ملک کو آمریت کے تسلط میں دیا جا سکتا تھا۔

جو لوگ تھوڑی بہت سیاسی بصیرت رکھتے ہیں۔ انہیں تو بالکل ابتدا ہی میں اس بات کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ ملک کو آمریت کے چنگل میں گرفتار کرنے کے لیے مذموم کوششیں کی جا رہی ہیں۔ چنانچہ جب سرحد میں آئی۔جی پولیس کو وزیر اعلیٰ کا منصب سونپا گیا، اور پنجاب کے آئی۔جی کو بلوچستان میں بطور پولیٹیکل ایجنٹ تعینات کیا گیا، تو اس وقت ہی اس ملک کے خیر خواہوں کا ماتھا ٹھنکا۔ انہوں نے آنے والے خطرات کی طرف واضح الفاظ میں اشارہ کیا۔ مگر ارباب حکومت نے ان کی باتوں کو قطعاً درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور ملک آہستہ آہستہ آمریت کی طرف بڑھتا رہا۔ ابھی تھوڑی مدت گزرنے بھی نہ پائی تھی کہ لاہور میں مارشل لا کا نفاذ کر کے عوام کے ردِ عمل کو معلوم کرنے کی کوشش کی گئی اور ارباب حکومت نے جب حالات کو آمریت کے لیے سازگار پایا تو ایک سرپھرے گورنر جنرل نے جس کی عمر کا بیشتر حصہ سرکاری ملازمت میں گزرا تھا، اسمبلی کو توڑ کر آمریت کی باقاعدہ ابتدا کر دی۔ اس کی اس مجنونانہ حرکت کو عدالت میں چیلنج کیا گیا۔ یہ ایک ایسا نازک اور فیصلہ کن مرحلہ تھا کہ اگر اس وقت عدالت جرأت اور تدبّر سے کام لے کر صحیح فیصلہ صادر کر دیتی تو نہ صرف جمہوریت کی پٹڑی سے اتری ہوئی گاڑی دوبارہ پٹڑی پر آ جاتی بلکہ جو لوگ اس قسم کے ناپاک عزائم سینوں میں پال رہے تھے ان کے حوصلے بھی پست ہو جاتے مگر افسوس کہ ایک عاقبت نا اندیش جج کے ذاتی رجحانات اور مصالح کی وجہ سے گورنر جنرل کی اس غیر قانونی بلکہ تباہ کن حرکت کو سندِ جواز حاصل ہو گئی اور اس طرح وہ سارے مہم جو جو اس ملک میں آمر بننے کے خواب دیکھ رہے تھے، انہوں نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ ملک غلام محمد کے بعد ایک ڈیفنس سکرٹری ملک کا سربراہ بن بیٹھا اور بالآخر اس کی سرپرستی میں ملک کے اندر فوجی انقلاب لایا گیا اور فوج کا وہ کمانڈر جسے قوم نے دفاعِ وطن کا فریضہ سونپ رکھا تھا، اس نے سارے دستوری ضابطوں اور روایات کو توڑتے ہوئے اور اس بلند منصب کے وقار اور عہد و پیمان کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے

مسندِ حکومت پر بالجبر قبضہ کر لیا۔ بے بصیرت لوگوں نے اس کو نجات دہندہ سمجھتے ہوئے اس کا والہانہ استقبال کیا لیکن جو لوگ سیاسی مسائل کی تھوڑی سی بھی سوجھ بوجھ رکھتے تھے ان سے یہ حقیقت کسی طرح بھی پوشیدہ نہ تھی کہ آمریت کی راہ پر چل کر کبھی بھی کسی قوم نے فلاح و کامرانی کی راہ نہیں پائی بلکہ اس راہ پر گامزن ہو کر قومیں ہمیشہ تباہ و برباد ہی ہوئی ہیں۔ تاریخ کے اس اہم فیصلے کو سمجھنے کے لیے کسی غیر معمولی قابلیت یا فہم و تدبر کی ضرورت نہیں۔ تاریخ کا یہ فیصلہ اس سادہ سی حقیقت پر مبنی ہے کہ کوئی غیر نبی، خواہ فکر و عمل کی کتنی ہی بے پناہ صلاحیتوں کا مالک ہو، اجتماعی زندگی کے سارے معاملات تنہا حل نہیں کر سکتا۔ وہ جب بھی اپنے ذمے یہ وسیع کام لیتا ہے تو لازمی طور پر ناکام ہوتا ہے مگر اُس کا آمرانہ مزاج اُسے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرنے میں ہمیشہ مانع رہتا ہے اور وہ ہر اُس فرد یا گروہ کو گردن زدنی سمجھتا ہے جو اُس سے اختلاف کرے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اردگرد خوشامدیوں کا لاؤلشکر جمع ہو جاتا ہے جو اُسے غلط راستے پر جانے سے باز رکھنے کے بجائے اُسی پر برق رفتاری کے ساتھ گامزن ہونے میں مدد دیتا ہے۔ خوشامدیوں کے اس ٹولے کو نہ تو اس آمر سے کوئی حقیقی دلچسپی ہوتی ہے اور نہ اُسے ملک و ملت کی خیر خواہی مطلوب ہوتی ہے اس کے پیشِ نظر تو صرف ایک مقصد ہوتا ہے کہ صاحبِ اقتدار کا کسی نہ کسی طرح قرب حاصل کر کے ہر قسم کے جائز و ناجائز فوائد حاصل کیے جائیں۔ اس لیے کاسہ لیسوں کا یہ گروہ کبھی بھی کسی آمر کو کوئی ایسا مشورہ نہیں دیتا جس سے اُس کا مزہ کِرکرا ہونے کا کوئی امکان ہو۔ بلکہ یہ اُس کی ہر بات اور ہر حرکت پر تعریف کے ڈونگرے برساتا ہے خواہ وہ کتنی ہی غلط اور ملک و ملت کے لیے کتنی تباہ کن ہو۔ یہ بے ضمیر ٹولہ اصحابِ اقتدار کو یہی باور کراتا رہتا ہے کہ حضور کا اقبال ترقی پر ہے۔ بس چند ہی لوگ ایسے ہیں جو آپ کی اقبال مندی سے جل کر راکھ ہو رہے ہیں۔

یہی وہ مفاد پرست اور بے ضمیر ٹولہ تھا جس نے انگریز کے دور میں غیر ملکی استعمار کا ساتھ دیا، اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بے دریغ ہو کر اپنے بھائی کا گلا کاٹا۔ اس کے بعد جب اس نے یہ محسوس کیا کہ انگریز اس ملک کو چھوڑنے پر مجبور ہے تو یہ ٹولہ مختلف حیلوں اور بہانوں سے مسلم لیگ کی صفوں میں گھس آیا اور اس طرح پاکستان کے سیاہ و سپید کا مالک بن بیٹھا۔ یہی وہ ٹولہ تھا

جس نے غلام محمد کو دستور ساز اسمبلی توڑنے پر مبارک باد پیش کی اور جس نے سکندر مرزا جیسے عقل و خرد سے عاری شخص کے اشارے پر ری پبلکن پارٹی میں شامل ہو کر مسلم لیگ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ اس مفاد پرست ٹولے نے فیلڈ مارشل محمد ایوب کے فوجی انقلاب کی بڑھ چڑھ کر پذیرائی کی اور اُسے ایک "عظیم رہنما" کے لقب سے ملقب کرتے ہوئے اس کی شان میں قصیدے پڑھنے شروع کیے۔ فیلڈ مارشل صاحب فوجی انقلاب کے پہلے چند سال تو اس گروہ کی قصیدہ خوانی سُن سُن کر دل ہی دل میں خوش ہوتے رہے لیکن کچھ مدت گزرنے کے بعد انھوں نے یہ محسوس کیا کہ مدح سرائی کرنے والوں کی اگر جتھہ بندی کر دی جائے تو ان سے قصیدہ خوانی کے علاوہ بعض دوسرے کام بھی لیے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اس ارادے کی تکمیل کے لیے کنونشن مسلم لیگ کی بنیاد رکھی ، اور یہ مفاد پرست ٹولہ فوراً اس میں شامل ہو گیا اور فیلڈ مارشل صاحب کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں اس راستے پر ڈال دیا جو نہ تو ان کے لیے اور نہ ملک و ملّت کے لیے خیر اور بھلائی کی راہ تھی۔ اس غلط راستے پر چلنے کے جب خوفناک نتائج کھل کر سامنے آنے لگے تو عوام میں بیزاری کی ایک عام لہر پیدا ہوئی، جس نے بالآخر ایک عوامی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ خود فیلڈ مارشل صاحب کو بھی اس امر کا احساس ہُوا کہ وہ عوام کے جمہوری حقوق سلب کر کے نہیں بلکہ اُن کی محافظت کر کے ملک و ملت کی بہتر طور پر خدمت کر سکتے ہیں۔ انھوں نے اس احساس کے پیشِ نظر تمام سیاسی پارٹیوں کی گول میز کانفرنس طلب کی تاکہ ملک کو جمہوری راستے پر ڈال دیا جائے لیکن عین اس نازک مرحلے پر جب جمہوریّت کی صبح طلوع ہونے والی تھی، آمرانہ عزائم رکھنے والے چند مخصوص طبقوں نے اس کانفرنس کو ناکام بنا دیا، جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ملک ایک مرتبہ پھر آمریت کی تاریکیوں میں بھٹکنے لگا۔

پاکستان میں آمریت کے مکمل تسلّط کی کوششوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ علاوہ اور بہت سے دوسرے اسباب کے ایک بڑا سبب جس کی بنا پر یہ کوششیں بار آور نہ ہو سکیں وہ پاکستان کے دو بازوؤں کا وجود تھا۔ آمریت کی کامیابی کا انحصار یُوں تو متعدد عوامل پر ہوتا ہے لیکن ایک چیز جو اس کے تسلط میں براہِ راست نہ سہی بلکہ بالواسطہ طور پر مُمِد و مُعاون ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ملک چھوٹا ہو اور سارا علاقہ ایک دوسرے سے ملحق ہو۔ درمیان میں کوئی دوسری حکومت حائل نہ ہو۔ پاکستان

چونکہ ایک ایسا وسیع و عریض ملک ہے جس کے دونوں بازوؤں کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلہ ہے اس لیے آمریت بیک وقت پاکستان کے دونوں حصوں پر اپنا تسلط پوری طرح قائم کرنے میں ہمیشہ ناکام ہوتی۔ اس قسم کے پیہم ناکام تجربات کے بعد دونوں بازوؤں کے آمر اس نتیجہ پر پہنچے کہ جب تک پاکستان کے ایک حصے کو کاٹ کر دوسرے سے بالکل الگ نہیں کر دیا جاتا اس وقت تک آمریت کے تسلط کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اس احساس کے بعد ہی ملک کے دونوں بازوؤں میں ایسی تحریکات نے جنم لیا جن کا مقصد ہی ملک کے حصے بخرے کرنا تھا۔ ان تحریکوں کے مزاج کا ہم جب مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں تین نمایاں خصوصیات پاتے ہیں:

(۱) ان تحریکات کی سربراہی ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو "اُدھر تم اور اِدھر ہم" کا نعرہ لے کر میدانِ عمل میں اُترے تھے۔

(۲) ان تحریکات کا خمیر ایک دوسرے کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات سے اٹھایا گیا تھا۔ جن لوگوں نے مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی ان تحریکوں کو شروع کیا انہوں نے عوام کے اندر اس باطل خیال کو راسخ کرنے کی کوشش کی کہ مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان کا بُری طرح استحصال کر رہا ہے اس لیے جب تک مشرقی پاکستان کے لوگ مغربی پاکستان سے نجات حاصل نہیں کر لیتے اس وقت تک وہ استحصال سے بچ نہیں سکتے۔ ادھر مغربی پاکستان میں عوام کے اندر یہ تاثر پھیلایا جا رہا تھا کہ مشرقی پاکستان مغربی خطے پر بوجھ بنا ہوا ہے وہ جب تک اس بوجھ کو اُتار نہیں پھینکتا اس وقت تک اس کی معیشت درست نہیں ہو سکتی۔

(۳) پھر ان تحریکات کے اثر و نفوذ اور دائرۂ کار کو بھی الگ الگ خطے تک محدود رکھا گیا تاکہ دونوں کے درمیان بُعد اور بیگانگی بڑھتی چلی جائے۔ پیپلز پارٹی کا سارا زور صرف مغربی پاکستان تک محدود تھا اور وہ بھی صرف دو صوبوں کی حد تک۔ عوامی لیگ کا مشرقی پاکستان میں چرچا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ اس قسم کی علاقائی تحریکوں کے زور پکڑنے اور عوام میں مقبول ہونے سے ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان اتحاد اور اتفاق کی راہ تو ہموار نہ ہو سکتی تھی بلکہ افتراق و انتشار کی قوتوں کو کام کرنے کے مواقع فراہم ہو رہے تھے۔

(باقی ص ۲۶ پر)

(بقیہ اشارات)

مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے منقطع کرنے کے لیے جن نفسیاتی محرکات اور تخریب پسندانہ رجحانات کی ضرورت تھی اُن کی اچھی طرح پرورش کر لینے کے بعد عملاً جو کچھ ہُوا وہ ان محرکات اور رجحانات کے تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ ذہن تو ایک دوسرے کے خلاف نفرت و حقارت کے آتش گیر مادے سے پہلے ہی بھرے ہوئے تھے صرف چنگاری لگانے کی ضرورت تھی وہ بھارت نے بڑی عیاری کے ساتھ لگا دی۔ اور اس طرح مشرقی پاکستان میں بغاوت کی آگ بڑی تیزی کے ساتھ پھیلنے لگی۔ پاکستانی فوج نے جب طاقت کے زور سے اسے فرو کرنے کی کوشش کی تو بھارت براہِ راست اور روس اس کے سرپرست کی حیثیت سے درمیان میں آدھمکے اور اس طرح پاکستان کے مشرقی بازو کو مغربی بازو سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا۔

مشرقی پاکستان میں ملک کے تحفظ کے لیے جو لڑائی بھی لڑی گئی اُسے دیکھتے ہوئے کوئی عقلمند شخص یہ باور نہیں کر سکتا کہ پاکستان کے سربراہ اس معاملے میں سنجیدہ تھے۔ یہ لڑائی تو درحقیقت ایک نمائشی جنگ کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ مشرقی پاکستان کی جغرافیائی حیثیت کا جائزہ لیتے ہوئے اس حقیقت کو ایک معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا آدمی بھی جان سکتا ہے کہ مغربی پاکستان سے براہِ راست مشرقی پاکستان کا تحفظ نہیں کیا جا سکتا اس لیے اس امر کی ضرورت تھی کہ اس خطے میں ایسے مؤثر اور وسیع انتظامات کیے جاتے جن سے اس حصے کا بخوبی دفاع کیا جا سکتا۔ اس کے لیے اپنے دوست ممالک سے بھی پُوری پُوری امداد اور تعاون حاصل کرنے کی ضرورت تھی مگر ان حقائق کو جانتے ہوئے بھی ان سے جان بُوجھ کر اغماض برتا گیا۔ کیونکہ اصل مقصد اس حصے کو بچانا نہ تھا بلکہ کھونا تھا۔ آٹھ ڈویژن فوج کو بلا سوچے سمجھے میدانِ جنگ میں اتار دیا گیا لیکن اس کے لیے نہ تو کمک پہنچانے کا کوئی انتظام کیا گیا اور نہ ہوائی حملوں سے تحفظ کی کوئی مؤثر تدابیر اختیار کی گئیں۔ دورِ جدید میں جس فوج کو ہوائی تحفظ حاصل نہ ہو اور جسے اس بات کا یقین نہ ہو کہ اُسے جنگ کی حالت میں برابر کمک پہنچتی رہے گی وہ کس طرح دیر تک اُس دشمن کے خلاف صف آرا ہو سکتی ہے جو نہ صرف تعداد بلکہ اسلحہ اور دوسری جنگی سہولتوں کے اعتبار سے اُس سے کئی گنا بڑی طاقت ہو۔ جس قسم کے حالات مشرقی پاکستان میں پیدا کیے گئے تھے اور جس بے تدبیری کے ساتھ فوج کو بالکل بے یار و مددگار جنگ کی آگ میں جھونکا گیا تھا اس میں سوائے ہتھیار ڈالنے کے اور

کس نتیجہ کی توقع کی جا سکتی تھی اور یہ سب کچھ کیا بھی اس لیے گیا تھا کہ پاکستان کے دونوں بازو ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جُدا ہو جائیں اور ان دونوں میں آمریت کے تسلط کے بھرپور مواقع فراہم ہو سکیں۔ مگر اب لوگوں کے دل و دماغ میں یہ تاثر قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اس المیہ میں ان آمرانہ عزائم رکھنے والوں کا کوئی عمل دخل نہیں بلکہ یہ سب کچھ وہ محض مقدر کے طور پر قبول کر رہے ہیں۔ انہیں بدقسمتی سے اس ملک کی سربراہی کا منصب اس وقت سنبھالنا پڑ رہا ہے جب یہ تباہی کے بالکل دہانے پر پہنچ چکا ہے۔ مظلومیت کی تصویر بننے سے ان حضرات کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عوام کے دلوں میں اپنے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا کیا جائے تاکہ وہ ان کی بداعمالیوں پر نگاہ رکھنے کے بجائے انہیں مظلوم اور بے بس سمجھتے ہوئے ان کے ناروا تسلط اور ظالمانہ کارروائیوں کو ایک طویل عرصے تک برداشت کرتے رہیں درآنحالیکہ تباہی کے جس دہانے کا ذکر کر کے یہ عوام کے جذبات میں ارتعاش پیدا کرتے ہیں اُس تک ملک کو پہنچانے والے خود یہی لوگ ہوتے ہیں۔ اور جس بربادی کو یہ مقدر کہہ کر اور جن دردانگیز نتائج کو حقائق کا نام دیکر لوگوں کو انہیں قبول کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس بربادی اور ان نتائج کے یہ حضرات خود ذمہ دار ہوتے ہیں۔

سقوط ڈھاکہ اور شملہ کانفرنس میں حکمران طبقے کا موقف اسی غلط اندازِ فکر کی پوری پوری شہادت فراہم کرتا ہے۔ مشرقی پاکستان کسی آفت سماوی کی وجہ سے تو ہم سے الگ نہیں ہُوا بلکہ اس ضمن میں جو کچھ ہُوا ہے وہ حکمران طبقوں کی مسلسل حماقتوں کا بالکل طبعی نتیجہ ہے۔ اسی طرح شملہ کانفرنس میں ہم نے جو ذلت آمیز شرائط قبول کی ہیں تو یہ تقدیر کا کوئی ایسا اٹل فیصلہ نہیں، جس کے سامنے ہم سرِ تسلیم خم کرنے پر بالکل مجبور رہیں۔ ہم نے سب سے پہلے وہ حالات پیدا کیے جو ہماری شکست پر منتج ہوئے اور اب شکست کو فتح میں بدلنے کے لیے جس تدبّر، حکمت و دانائی، عزم، اخلاص اور قوتِ عمل کی ضرورت ہے اُسے ہمارا حکمران طبقہ نہ تو اپنانے کی ہمت رکھتا ہے اور نہ ارادہ، اس لیے وہ عوام کے ذہنوں کو شکست پر قانع کرنے کے لیے یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا ہے یہ نوشتہ تقدیر ہی ہے جس کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ کار نہیں ہو سکتا۔